دو قومی نظریہ اور علماء اہلسنت

از

قاضی مصطفیٰ کامل (ایم اے)

علماء اہلسنت کی کتب PDF میں
حاصل کرنے کیلئے
تحقیقات چینل ٹیلیگرام جوائن
کریں
https://t.me/tehqiqat
گوگل سے ڈاؤن لوڈ کرنے لئے
https://
archive.org/details/
@zohaibhasanattari

طالب دعا زوہیب حسن عطاری

دو قومی نظریہ اور علمائے اہلسنت

بسلسلہ تخلیق پاکستان

قاضی مصطفیٰ کامل

ملنے کا پتہ: مبارک سنز سٹیشنرز ۸۔ اردو بازار لاہور

قیمت ۲۵ پیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاک و ہند کی جدوجہد آزادی کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم کیلئے اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ ۱۹۳۰ء تک متحدہ ہندوستان کے مسلم سیاسی راہنماؤں کی سیاسی کاوشوں اور جدوجہد کا دائرہ مجالس قانون ساز اور انجمنوں کے پلیٹ فارموں تک محدود رہا اور وہ اسی نوعیت کے مختلف دائروں میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے لڑتے رہے اور جہاں تک ہندوستان کی آزادی کا سوال تھا اس میں متحدہ قومیت ہی کا نظریہ کارفرما رہا مسلمانوں کے سیاسی زعماء ایک عرصے تک ہندو مسلم اتحاد کیلئے کوشاں رہے حتیٰ کہ خود حضرت قائد اعظم بھی انتہائی خلوص کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کیلئے جدوجہد کرتے رہے لیکن ہندوؤں کی مسلم دشمنی کی پالیسی اور کانگرسی لیڈروں کی عیارانہ چالوں کی وجہ سے کوئی قابلِ قبول صورت پیدا نہ ہو سکی۔

قائد اعظم نے مسلم لیگ کے اجلاس لاہور (مئی ۱۹۲۴ء) میں فرمایا "ہندوستان

یں غیر ملکی حکومت کا آغاز اور اس کا جاری رہنا محض اس سبب سے ہے کہ ہندوستان کی قومیں اور بالخصوص ہندو اور مسلمان متحد نہیں ہیں۔ اور ایک دوسرے پر باہم اعتماد نہیں کرتے۔ ہیں قریب بالکل یہ کہنے کی طرف مائل ہوں کہ جس دن ہندو اور مسلمان متحد ہو جائیں گے۔ ہندوستان کو نو آبادی کے درجے کی ذمہ دار حکومت مل جائے گی۔" (پاکستان ناگزیر تھا۔ ۱۵۶)

لیکن ہندو اور کانگرس کی کتاب سیاست میں مسلمان کیلئے کوئی باعزت اور باوقار مقام درج ہی نہیں تھا۔ اس لئے آخر کار مسلمانوں کے مخلص سیاسی رہنما ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہو گئے۔ بلکہ تجربے نے انہیں یہ سکھایا کہ ہندو مسلم اتحاد اگر کوئی صورت نکلی تو وہ مسلمان کیلئے نقصان دہ ہوگی کانگرس مسلسل اس بات کا پروپیگنڈا کرتی رہی کہ وہ ہندوستان کی تمام قوموں (خصوصاً ہندو مسلم) کی نمائندہ جماعت ہے۔ تا آنکہ ۱۹۳۰ء میں آلہ آباد میں علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں ارشاد فرمایا۔

"آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کیلئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت ہے۔ جو کہ انسانی کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اس کی فطری وسعتوں میں

اذن بال کتائی دیگا۔ جس کا عقیدہ ہے کہ مذہب انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین طاقت کا حامل ہے اور جس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیر الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہ ہو گی۔ (تحریک پاکستان ص۱۶)

لہذا اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے الگ نہیں دونوں ایکدوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک کرنا بھی لازم آئیگا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہو گا جو کسی ایسے وطنی اور قومی اصول پر مبنی ہو۔ جو اسلام کے اصول اتحاد کے منافی ہو۔"

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں کہ اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائیدار تصفیہ کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانان ہند کو اپنی روایات تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔"

(حب پ ۶۵)

"ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اگر ہم چاہتے

ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں دینی مرکزیت قائم کر سکے۔ اس طرح نہ صرف ہندوستان کا مسئلہ حل ہو جائیگا بلکہ خود اس سے مسلمانوں کے احساسات ذمہ داری قوی ہو جائیں گے اور ان کا جذبہ حب الوطنی بڑھ جائے گا۔"

(ت پ ص۶۸)

اب ایک طرف تو یہ مخلص اور دردمند قومی راہنما تھے جو سیاسی عمل اور تجربے کی بنا پر یہ رائے اختیار کر چکے تھے کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان مستقبل میں بحیثیت ایک قوم تبھی زندہ رہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے دین کو اپنا راہنما بنالیں اور اپنی تہذیب و ثقافت کے فروغ کے لئے اپنا الگ خطۂ زمین حاصل کر لیں لیکن دوسری طرف مذہب ہی کے لبادوں میں ملبوس بڑے بڑے شیخ الہند اور شیخ الحدیث گاندھی کی نقاب پوش سیاست کے نقیب بنے ہوئے تھے اور متحدہ قومیت کے نظریے کو قرآن و حدیث سے ثابت کیا جا رہا تھا۔ ان میں نمایاں طور پر علماء جمعیت العلماء ہند اور مجلس احرار کے بڑے بڑے زعما شامل تھے یعنی مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور صاحبزادہ فیض الحسن

اور شیعہ پولیٹیکل پارٹی سبھی کانگرس کے موقف کے براہ راست یا بالواسطہ طور پر حامی تھے۔ ان میں بڑے بڑے شعلہ باز مقرر اور سٹیج کے ماہر لوگ موجود تھے۔ جو پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں متحدہ قومیت کا پیغام پھیلا رہے تھے۔

اس صورت حال کے پیش نظر تاریخ کے طالب علم کا فرض ہے کہ وہ تلاش کرے کہ آخر وہ کون سی زبردست قوت تھی جس نے برعظیم پاک و ہند کے مسلم عوام کے اذہان و قلوب میں دو قومی نظریہ اور مسلمان کی انفرادیت کا عقیدہ ایمان کی طرح پختہ کر رکھا تھا جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء (علامہ اقبال کے خطبۂ الہ آباد) سے قبل جداگانہ قومیت کا نعرہ سیاسی سٹیج پر کبھی بھی بلند نہ ہو سکا۔ اور اس کے بعد بھی ۱۹۳۶ء تک مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کرنے والا کوئی نہ تھا۔

مولانا محمد علی جوہر ۳ جنوری ۱۹۳۱ء کو وفات پا چکے تھے۔ قائداعظم ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۵ء لندن میں قیام پذیر رہے کیونکہ لارڈ ویلنگڈن جس زمانہ میں بمبئی کے گورنر تھے۔ اس زمانے میں قائداعظم اس سے ایک جنگ لڑ چکے تھے جس میں ویلنگڈن کو شکست ہوئی تھی۔ اب اسی دوران وہی لارڈ ویلنگڈن ہندوستان کا وائسرائے بن کر آ گیا۔ اس لئے قائداعظم جو پہلے ہی ہندو اور کانگرس کی عیاری اور تنگ نظری سے دل برداشتہ ہو چکے

تھے۔ نئے وائسرے کی آمد پر ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہ ہندوستان میں مقیم رہیں۔ آخر اپریل ۱۹۳۶ء سے مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا آغاز ہوتا ہے اس کے بعد یہ جماعت ڈرائنگ روم سے عوامی سطح کی طرف قائد اعظم کی جرأت مندانہ قیادت میں بڑھنا شروع کرتی ہے۔

بعض لوگ اس خلا کو پر کرنے کے لئے سر سید اور علی گڑھ تحریک سے ڈانڈے ملائیں گے۔ لیکن ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ سر سیّد اپنے بعض مذہبی عقائد اور قرآنِ پاک کی تفسیر میں ٹھوکریں کھانے کی وجہ سے عوام میں نیچری اور دہریہ کے نام سے مشہور تھے اور مغرب کی پیروی کے انتہا پسندانہ نظریات کی بنا پر ان کے ہم عصروں میں دوسروں کے علاوہ اکبر الہ آبادی نے بھی ان کی شدید مخالفت کی تھی۔ لہٰذا یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سر سید اور علیگڑھ کی بات صرف طبقہ خواص تک ہی محدود تھی اور عوام کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور طبقہ خواص میں انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اور جاگیردار ہی تو تھے جن کی اکثریت کانگرس یونینسٹ اور مسلم لیگ میں تقسیم تھی۔ دراصل اس خلا کو پر کرنے کے لئے ہمیں ان بوریہ نشینوں اور درویشوں کے طرزِ عمل اور نظریات کا جائزہ لینا ہو گا۔ جو دین کی حفاظت اور قال اللہ و قال الرسول کے نغمات کو بلند رکھنے کے لئے مذہبی قیادت کی لڑائی

سے الگ اپنی انجمن سجائے بیٹھے تھے اور جن کے پیش نظر حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور حضرت مجدد الف ثانی کا طرز فکر تھا جو سولہویں اور سترھویں صدی میں اکبری الحاد کی سازش کی تہ میں ہندو تہذیب کے غلبے سے اسلام کو بچانے کے لیے میدان میں کود پڑے تھے اب بیسویں صدی کے آغاز میں پھر متحدہ قومیت کے نعرے لگے پردے میں ہندو کی وہی عیاری کارفرما تھی نیشنلسٹ علماء اور علمائے دیوبند ہندو کی سازش کے اسیر ہو چکے تھے۔ گاندھی، نہرو احمد پٹیل کی قیادت کو تسلیم کر رہے تھے۔ گاندھی کو مسجدوں میں لے جا کر تقریریں کروائی جا رہی تھیں اس صورتحال پر امام اہلسنت حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے شدید احتجاج کیا۔ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد اور موالات کی تحریک کی شدید مذمت کی چنانچہ آپ اپنی تصنیف المحجۃ المؤتمنہ کے صفحہ ۴۸ پر گاندھی کی پیروی کرنے والے مسلمانوں اور ان کے لیڈروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں

جب ہندوؤں کی غلامی ٹھہری پھر کہاں کی غیرت اور کہاں کی خودداری ۔ ۔ ۔ ۔ تم ان نجسوں کو مقدس مسجد بیت اللہ میں لے جاؤ جو تمہارا تھار کھنے کی جگہ ہے وہاں ان کے گندے پاؤں رکھواؤ مگر تم کو اسلامی حس ہی نہیں صحبت مشرکین نے اندھا بہرا کر دیا۔"

آپ اپنی دینی، تبلیغی اور تدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ مسلم قوم کو ہندوؤں کی سازشوں سے بھی خبردار کرتے رہے آپ کی شہرت اور رائے کا احترام نہ صرف پورے ہندوستان میں بلکہ بلادِ عرب میں بھی موجود تھا۔ آپ کے شاگرد اور خلیفہ مولانا سلیمان اشرفؒ جو کہ علیگڑھ میں پروفیسر تھے انہوں نے اپنی کتاب "النور" میں اس وقت کے حالات پر کچھ روشنی ڈالی ہے، یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علیگڑھ نے شائع کی اس کتاب پر یہ جملہ درج ہے۔ "حالات حاضرہ پر ایک مصلحانہ نظر" ان کے علاوہ ہندوستان کے ہزاروں سنی علماء نے جو حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کو اپنا امام تسلیم کرتے تھے، اپنی نظریات کی تبلیغ کی اور ہندو کے ساتھ اتحاد و وحدت کی شدید مخالفت کی اور جداگانہ قومیت کے علم کو بلند رکھا۔

تاآنکہ مسلمانوں کے سیاسی قائدین نے بھی جداگانہ قومیت کے مطابق اپنا الگ وطن کا مطالبہ شروع کر دیا۔ چنانچہ جب ڈاکٹر علامہ اقبال" نے ۱۹۳۰ء میں خطبۂ الہ آباد ارشاد فرمایا جس میں جداگانہ قومیت اور جداگانہ وطن کا واضح نظریہ پیش کیا گیا تھا اس پر جہاں ہندو واویلا اس لئے حامی نیشنلسٹ علماء اور مکتب دیوبند کی نمائندہ جماعت جمعیت علمائے ہند کے سربراہ حسین احمد مدنی وغیرہ اقبال کے خلاف شدید

پراپیگنڈہ میں مصروف ہو گئے۔ وہاں ان کے مقابل اہلسنت علماء

کے ترجمان ماہنامہ "سوادِ اعظم" کے شمارہ ماہ شعبان ۱۳۵۹ھ

(مطابق ۱۹۴۰ء) میں علامہ اقبال کے ان افکار کی تائید میں

حضرت مولانا عمر نعیمی صاحب ص۱۲ پر لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر اقبال کی رائے پر کہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر

دیا جائے ایک حصہ ہندوؤں کے زیرِ اقتدار ہو۔ دوسرا مسلمانوں کے!

ہندوؤں کو کسی قدر اس پر غیظ آیا! یہ ہندو اخبارات دیکھنے سے

ظاہر ہو گا۔ کیا یہ کوئی ناانصافی کی بات تھی اگر اس سے ایک طرف

مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا تھا تو ہندوؤں کو بھی اسی نسبت سے نفع

ملتا۔۔۔۔ اس کو تو کون جانتا ہے کہ پردہ غیب سے کیا ظہور کریگا اور مستقبل کیا صورتیں سامنے

لائے گا لیکن ہندو اس وقت ایسی خالی بات بھی نوکِ زبان پر لانے کیلئے تیار نہیں ہیں جو

مسلمانوں کو اچھی معلوم ہو اس حالت میں بھی اگر کوئی مسلمان کہلانے والی جماعت ہندوؤں

کا کلمہ پڑھتی ہے اور اپنی اس پرانی فرسودہ لکیر کو پیٹا کرے تو اس

پر ہزار افسوس۔ کاش اس وقت یہ حضرات خاموش ہو جائیں اور

کام کرنے والوں کو کام کر لینے دیں"

ملک میں جداگانہ تقسیم کے بارے میں شوال ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۱ء)

کے شمارے میں قاضی محمد احسان الحق کا مضمون بعنوان "ہندوؤں کی مسلم دوستی"

ص۱۲ پر شائع ہوا ہے۔ مضمون کے آخر میں مولانا لکھتے ہیں۔
"بمبئی کے ہندو کوشش کر رہے ہیں کہ اپنی دکانیں مسلمان محلوں سے ہٹا کر ہندو محلوں میں لے جائیں۔ لیکن مسلمان ایسا کریں تو اتحاد کے دشمن قرار دیئے جاتے ہیں۔ یہ کھلی ناانصافی ہے جب ہندو اپنی حفاظت اسی میں سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے محلوں سے علیحدہ ہو جائیں اور اپنے حدود علیحدہ کریں۔ تو مسلمانوں کو یقیناً ان کے محلوں میں جانے اور ان کے ساتھ کاروبار رکھنے سے احتیاط کرنی چاہیئے۔ دونوں اپنے اپنے حدود جداگانہ قرار دیں اور اسی نقطہ کو ملحوظ رکھ کر سیاسی مباحث کو طے کریں یعنی ہندوستان بھی ملک کی تقسیم سے ہندو مسلم علاقے جدا جدا بنالیں تاکہ باہمی تصادم کا اندیشہ اور خطرہ باقی نہ رہے۔"
یہ دیکھئے کہ مسلمانوں کے لئے الگ وطن کا مطالبہ کیسے احسن طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دو قومی نظریہ اور مسلمانوں کی تہذیبی انفرادیت کا جو علم علمائے اہلسنت کے راہنما مولانا احمد رضا فاضل بریلوی نے ابتداءً ۱۹۲۰ء میں بلند کیا۔ جب تمام دینی اور سیاسی جماعتوں کے راہنما وطنی قومیت کی زلف میں اسیر ہو چکے تھے اسے مذکورہ

جماعت کے علماء نے نہ صرف سرفراز رکھا، بلکہ ۳۱-۱۹۳۰ء میں
ہی ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ بھی پیش کر دیا۔ اس مشن کے
لیے ان تھک کوشاں رہنے والوں میں امیر ملت حضرت پیر
جماعت علی شاہ علی پوری، حضرت محدث کچھوچھوی اور صدرالا فاضل
مولانا نعیم الدین مراد آبادی، سندھ سے حضرت پیر صاحب جھنڈو
شریف پنجاب سے پیر صاحب خواجہ قمرالدین سیالوی اسرحد سے
پیر صاحب زکوڑی شریف اور پیر صاحب مانکی شریف جیسی مرکزی
شخصیتیں تھیں۔ حضرت علی پوری تو پورے ہندوستان میں تبلیغی
دورے کرتے۔ کشمیر سے دکن تک ہر جگہ آپ کے معتقدین موجود
تھے۔ انہوں نے ہی آل انڈیا سنی کانفرنس کی سرپرستی کی جس کے
اجلاس ۱۹۲۳ء تا ۱۹۴۶ء پیر صاحب موصوف کی صدارت میں
منعقد ہوتے رہے آپ فرمایا کرتے "مسلمانو! دو جھنڈے ہیں۔
ایک مسلمانوں کا اور دوسرا ہندوؤں کا بتاؤ کس کے پرچم کے سائے
میں رہنا چاہتے ہو؟ پس لوگ مسلم لیگ میں داخل ہو جاتے۔
۱۹۴۶ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس کا اجلاس بنارس میں منعقد
ہوا۔ اس میں ہزاروں علماء اہلسنت اور مشائخ نے شمولیت کی
زعماء کے خیالات تقریباً ڈیڑھ لاکھ سامعین نے سنے اس کانفرنس

میں واشگاف الفاظ میں مطالبہ پاکستان کی تائید کی گئی اور ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے علماء نے پورے ہندوستان میں پھیل کر دھوم مچا دی۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ! مہم کے انداز میں جن علماء نے بھرپور کام کیا ان میں مولانا عبدالحامد بدایونی اور شیخ القرآن علامہ عبدالغفور ہزاروی زیادہ نمایاں ہوئے۔

مطالبہ پاکستان کے بارے میں مولانا نعیم الدین مراد آبادی (جو حضرت فاضل بریلوی کے ممتاز جانشین تھے) کے جذبات کا اندازہ ان کے اس مکتوب سے ہو سکتا ہے۔ جو انہوں نے ۲۲ رمئی ۱۹۴۶ء کو علامہ ابوالحسنات کے نام لکھا اس میں آپ نے تحریر کیا۔

"پاکستان کی تجزیہ سے جمہوریت اسلامیہ کو کسی طرح دستبردار ہونا منظور نہیں، خود مسٹر جناح اس کے حامی رہیں یا نہ رہیں، وزارتی مشن کی تجزیہ سے ہمارا مدعا حاصل نہیں ہوتا۔"

لیکن تحریک پاکستان اور جدوجہد آزادی کے عنوانات پر لکھنے والے مؤلفین ابھی تک ان علماء مشائخ کی خدمات کا اعتراف تو کجا ادھر توجہ بھی نہیں کر سکے۔ اس کی ایک واضح وجہ ہے اور وہ یہ کہ علماء اور مشائخ کی خدمات کے باب کو حذف کرتے

سے لادین سیاست کے علمبرداروں کے لئے یہ آسان ہو جاتا ہے کہ وہ تحریک پاکستان اور نظریہ پاکستان کو جو چاہیں رنگ دیتے رہیں۔ لیکن تاریخ کا عمل تلوار کی دھار کی طرح بے رحم ہوتا ہے اور تاریخ کی صداقتیں آخر کار سب تعصبات کے بت توڑ کر اپنا آپ منوا لیتی ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم مستقبل سنوارنے کے لئے اپنا ماضی نکھاریں اور اسے صحیح شکل میں زندہ کریں۔

قاضی مصطفیٰ کمال ایم اے